ہیومنزم کی فکری تشکیل:نشاۃِ ثانیہ سے مسلم معاشرے تک: The Intellectual Formation of Humanism: From the Renaissance to Muslim Societies. Pakistan Journal of Islamic Research, 26(2), 33-49.

ہیومنزم کی فکری تشکیل: نشاۃِ ثانیہ سے مسلم معاشرے تک

The Intellectual Formation of Humanism: From the Renaissance to Muslim Societies

محمد اشفاق*

حسنین علی**

Abstract

This article offers a critical examination of the intellectual and historical development of Humanism and its impact on Muslim societies. It starts by defining Humanism as a philosophical orientation and explores its relationship with religion, particularly Christianity. The study situates the emergence of Humanism within the broader context of the Renaissance, highlighting the decline of ecclesiastical authority, the rise of rationalism, and the increasing emphasis on human autonomy. Special attention is given to the French Revolution as a pivotal moment in the consolidation of secular Humanism and the marginalisation of religion in public life. The article further analyses the major factors contributing to the rise of modern Humanism, including dissatisfaction with religious institutions, scientific progress, and the elevation of human reason as the ultimate source of knowledge and morality. Additionally, it examines the channels through which Humanist ideas entered the Muslim world and assesses their intellectual, ethical, and socio-cultural effects on Muslim societies. Finally, the article provides a critical evaluation of Humanism in light of the Islamic concept of the human being, arguing that while Humanism emphasises human dignity and moral responsibility, its anthropocentric and secular foundations are fundamentally at odds with the Islamic worldview, which is grounded in divine guidance, servitude to God, and the centrality of revelation. The study concludes by stressing the need for a balanced intellectual response within Muslim societies that engages with modern philosophical challenges without compromising core Islamic principles.

Keywords: Humanism, Renaissance, French Revolution, Secularism, Religion and Modernity, Islamic Thought, Muslim Societies, Anthropocentrism, Civilization and Culture.

انسانی تاریخ میں ہمیشہ دو بڑے مکاتب فکری موجود رہے ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ اس کائنات کو ایک برتر ہستی یعنی ذاتِ باری تعالیٰ کی تخلیق مانتا ہے۔ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ ہی خالق ومالک اور حاکم ہے، جس نے انبیاء کرام کے ذریعے انسان کو وہ تعلیمات عطا کیں جو دنیاوی اور اخروی فلاح کے لیے لازمی ہیں۔ یہ تعلیمات زندگی کے ہر پہلو میں رہنمائی فراہم کرتی ہیں اور انہی کو "شریعت" کہا جاتا ہے۔ شریعت اور ایمان کا مجموعہ "دین" کہلاتا ہے۔

* امپیریل انسٹیٹیوٹ ہائر سکینڈری سکول، جہانیاں۔

** سدریہ اسلامک سنٹر، ملتان۔

دوسرا گروہ عقل و شعور کو ہی زندگی کی بنیاد سمجھتا ہے۔ ان کے نزدیک فرد اور معاشرہ اپنی عقل کے سہارے زندگی گزارنے کا **عمل "تہذیب"** کہلاتا ہے۔ مغربی فکر میں اس رجحان کو فروغ دینے والے بڑے **مفکرین** میں ڈارون، روسو، ہیگل، نطشے، کانٹ، راجر بیکن اور فرائیڈ شامل ہیں۔ انہی کی فکر سے مغربی دانش نے جنم لیا اور اس کا ایک نمایاں پہلو "ہیومنزم (Humanism) " ہے، جو آج ایک عالمی فلسفے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

1789ء سے 1799ء تک جاری رہنے والا **فرانسیسی انقلاب** یورپ کی تاریخ کا ایک اہم موڑ تھا۔ اس کا بنیادی مقصد شہنشاہیت کا خاتمہ اور جمہوریت کا قیام تھا۔ اس انقلاب کے نتیجے میں بادشاہ **لوئی شانزدہم (Louis XVI)** کی حکومت ختم ہوئی اور **نپولین بوناپارٹ** نے نئے سیاسی و سماجی اصول متعارف کرائے، جنہوں نے مغربی یورپ کے ڈھانچے کو بدل کر رکھ دیا۔[1]

اٹھارویں صدی میں فرانس میں انقلاب برپا ہوا، جس نے شہنشاہیت کا خاتمہ کر کے جمہوریت، آزادی اور مساوات کے اصولوں کو فروغ دیا۔ یہ انقلاب ہیومنزم اور عقلیت پسندی کے اثرات کا عملی مظہر تھا۔ اس کے نتیجے میں یورپ میں فرد کی آزادی، قومی خود مختاری اور مساوات کے تصورات کو تقویت ملی۔

1808ء میں جرمن تعلیمی کمشنر **فریڈرک عمانوئیل** نے لفظ Humanismus کو کلاسیکی (یونانی و لاطینی) نصاب میں شامل کیا اور اسے جرمن ثانوی اسکولوں میں پڑھانے کا منصوبہ بنایا۔ 1836ء میں یہ اصطلاح انگریزی زبان میں داخل ہوئی اور 1856ء میں جرمن مورخ **جارج وائگٹ (Georg Voigt)** نے اسے "Renaissance Humanism" کے طور پر وضاحت کی۔ اس کے بعد ہیومنزم کو یورپ میں ایک اخلاقی فلسفہ سمجھا جانے لگا، جو انسانیت پر مرکوز تھا۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں "مذہبی ہیومنزم" ایک منظم گروہ کے طور پر سامنے آیا، جسے بعض حلقوں نے پروٹسٹنٹ ازم سے مشابہ قرار دیا۔ تاہم اس کا مرکز مذہب کے بجائے انسانی ضروریات، مشاغل اور صلاحیتیں تھیں۔

[1] Burke ,P. The European Renaissance: Centres Peripheries, 1997.

ہیومنزم کی اصطلاح اور ارتقاء:

ہیومنزم ایک ایسا فکری و فلسفیانہ نظام ہے جس میں انسان کو کائنات میں سب سے برتر اور مرکزی حیثیت دی جاتی ہے۔ اس تصور کے مطابق انسانی اقدار، انسانی فلاح اور انسانی شعور کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ نقطۂ نظر مذہب سے ہٹ کر دنیا کو سمجھنے کے لیے عقل، تجربے اور سائنس پر انحصار کرتا ہے۔ ہیومنزم کے حامیوں کے نزدیک یہ صرف ایک نظریہ نہیں بلکہ معاشرتی نظام کا فلسفہ ہے، جو انسان کی دلچسپیوں، مشاغل اور بہبود سے براہِ راست تعلق رکھتا ہے۔ اسی بنیاد پر اسے اخلاقیات، سماجی انصاف اور معاشی مساوات کا فلسفہ بھی کہا جاتا ہے۔

"لفظ ہیومنزم لاطینی اصطلاح Humanitas سے ماخوذ ہے، جس کا بنیادی مطلب ہے انسانی فطرت، تہذیب اور مہربانی"۔[2]

اس میں رحم دلی، احسان، اور ہمدردی جیسے اخلاقی پہلو شامل ہیں۔ انیسویں صدی میں یہ اصطلاح انگریزی زبان میں "ism-" کے اضافے کے ساتھ داخل ہوئی۔ قدیم رومی مفکر **مارکس کائیکرو** نے Humanitas کو "ذہن کی تربیت اور ایسی تعلیم جو عوامی خدمت کے لیے موزوں ہو" کے معنوں میں استعمال کیا۔ اطالوی مفکر **پیٹرارک** (Petrarch) کو ہیومنزم کا بانی سمجھا جاتا ہے، جس نے اس تصور کو منظم شکل دی۔

ہیومنزم کی تعریف: مغربی مفکرین نے ہیومنزم کی تعریف یوں بیان کی ہے:

ڈیوس ٹونی (Davis Tony) کے مطابق:

"ہیومنزم اقدار کا ایک ایسا نظام ہے جس میں انسان کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہ تصور اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان بغیر مذہب کے بھی اپنے مسائل کا حل تلاش کر سکتا ہے"۔[3]

سٹیفن لا (Stephen Law) کے مطابق:

"ہیومنزم ایک اخلاقی نظریہ ہے جو یہ واضح کرتا ہے کہ انسانوں کو کس طرح زندگی گزارنی چاہیے اور کس طرح عمل کرنا چاہیے"۔[4]

---

[2] Dewey, John. *A Humanist Manifesto*. The New Humanist, American Humanist Association, 1933.
[3] Davis, Tony. *Humanism: Values and Philosophy*. (Oxford: University Press, 1997).
[4] Law, Stephen. *Humanism: A Very Short Introduction*. (Oxford: University Press, 2011).

ہیومنزم کی تاریخی بنیادیں اور ارتقاء:

ہیومنزم کے زیرِ اثر:

خدا، وحی، آخرت، جنت و دوزخ اور فرشتوں جیسے تصورات کو علمی و فلسفیانہ مباحث سے خارج کر دیا گیا۔ روحانیت، بزرگی اور ولایت جیسے الفاظ کو غیر متعلق قرار دیا گیا۔ بحث کا مرکز کائنات اور انسانی زندگی کی مادی ترقی بن گئی۔ انسانی فلاح اور دنیاوی آسائش کو آخرت پر فوقیت دی گئی۔ سائنس اور فلسفہ کو عقائد کے بجائے انسانی زندگی کے مسائل اور ان کے حل کا ذریعہ سمجھا گیا۔

دوسری صدی عیسوی کے مفکر **Aulus Gellius** نے اس تصور کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ لاطینی بولنے والے اکثر Humanitas کے اصل معنی کو درست طور پر نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک یہ لفظ تمام انسانوں کے ساتھ دوستانہ رویہ اور اچھے جذبات رکھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یونانی فکر میں یہ اصطلاح تعلیم و تربیت اور لبرل آرٹس میں مہارت کے معنوں میں استعمال ہوتی تھی۔ بعد ازاں اطالوی مفکر **پیٹرارک (Petrarch)** نے اسے منظم فلسفیانہ شکل دی۔

Aulus Gellius کی وضاحت:

رومی مفکر **Aulus Gellius** نے لفظ Humanitas کے بارے میں یہ نکتہ اٹھایا کہ عام طور پر اسے انسان دوستی، رحم دلی اور دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے، لیکن یہ استعمال محدود اور غیر درست ہے۔ ان کے مطابق قدیم لاطینی ادیب، خصوصاً **مارکس کائیکرو**، اس لفظ کو زیادہ وسیع معنوں میں استعمال کرتے تھے، یعنی انسانی ذہن کی تربیت، شائستگی اور مہذب علم۔ یوں Humanitas میں دو بنیادی پہلو شامل ہیں:

- انسانی فلاح و بہبود
- علم اور ذہنی تربیت

یہی دونوں پہلو بعد میں نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے دور میں ہیومنزم کے بنیادی عناصر بنے۔

ہیومنزم کے منشور:

1933ء میں **یونیورسٹی آف شکاگو** میں ایک کانفرنس کے دوران پہلا ہیومنزم منشور جاری کیا گیا۔ اس منشور میں درج نکات کے مطابق:

"کائنات اپنی ذات میں موجود ہے، اسے کسی نے پیدا نہیں کیا۔ انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی زندگی کے فیصلے خود کرے۔ ہر انتخاب کا معیار یہ ہونا چاہیے کہ وہ انسانی زندگی کو بہتر بنانے میں مددگار ہو"۔[5]

یوں ہیومنزم انسان کو کائنات کا مرکز قرار دیتا ہے اور اس کی عقل و شعور کو زندگی کے فیصلوں کا پیمانہ سمجھتا ہے۔ جدید دور میں یہ نظریہ سیکولرزم سے قریب تر ہے۔

اسم منشور پر دستخط کرنے والے زیادہ تر ماہرینِ دینیات اور یونٹیرین وزراء تھے۔

"اس منشور میں واضح کیا گیا کہ ہیومنزم ایک اخلاقی فلسفہ ہے جس میں مذہب کے بجائے سائنس کو ترجیح دی جاتی ہے"۔[6]

فلسفی **جان ڈیوی (John Dewey)** بھی اس منشور کے دستخط کنندگان میں شامل تھے۔ 1973ء میں دوسرا ہیومنزم منشور پیش کیا گیا، جس نے پہلے منشور کی تصدیق کی اور کچھ اضافے بھی کیے۔ اس کا بنیادی نکتہ بھی یہی تھا کہ مذہب کے بجائے سائنس کو انسانی مسائل کے حل کا ذریعہ بنایا جائے۔

یونانی فکر میں ہیومنزم:

ہیومنزم کا ابتدائی تصور یونان میں پانچویں صدی قبل مسیح کے مفکر پروٹاگورس (Protagoras) کے مشہور قول سے وابستہ ہے:

"Man is the measure of all things"[7]

یعنی انسان ہی کائنات کا پیمانہ ہے اور اس کا مقام سب سے بلند ہے۔

---

[5] Dewey, J. *A Humanist Manifesto*. The New Humanist. American Humanist Association. 1933.

[6] Cicero. (43 BCE). Humanitas رومی ادب میں کلاسیکی کے استعمالات

[7] Protagoras. (5th Century BCE). Fragments. In Plato's Theaetetus.

افلاطون نے اس تصور کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ کوئی مطلق حقیقت موجود نہیں، بلکہ وہی حقیقت ہے جسے افراد سچ مانتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یونانی فکر میں انسان کو مرکزیت حاصل تھی اور انسانی عقل کو کائنات کی تفہیم کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔

نشاۃ ثانیہ اور ہیومنزم:

پندرہویں صدی میں اٹلی کے اساتذہ، فلسفیوں اور ادیبوں نے خود کو "انسانیت کے پیروکار" کہنا شروع کیا۔ اس دور میں ہیومنزم کا تصور تعلیم وتربیت، لبرل آرٹس، گرائمر اور شاعری کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ اسکولوں کے نصاب میں بھی ان علوم کو شامل کیا گیا تاکہ ایک ہمہ جہت شخصیت کی تشکیل ہو سکے۔ ہیومنزم کے قدیم یونانی نظریے کے مطابق انسان کو جسمانی اور ذہنی دونوں پہلوؤں میں کمال حاصل کرنا چاہیے تاکہ وہ زندگی کے ہر مرحلے میں باعزت کردار ادا کر سکے۔ یہی تصور بعد میں نشاۃ ثانیہ کے دور میں "عالمگیر انسان (Universal Man) " کے تصور کی بنیاد بنا۔

کسی بھی قوم کی تاریخ اس کی تمیز اور فکر کے عروج وزوال کا پتا دیتی ہے۔ جب وہ اپنی بقا اور احیا کے لیے دوبارہ زندہ ہونے کے اقدامات کرتی ہے تو اسے "نشاۃ ثانیہ" کہتے ہیں۔ انگریزی میں اس اصطلاح کے لیے Renaissance کا لفظ وسیع معنوں میں مستعمل ہے۔ عربی لغت "المنجد" میں نشاۃ ثانیہ کا مفہوم اس طرح بیان کیا گیا ہے:

نشا(ف) ونشوء(ک) نشاء، نشو، نشاۃ، نشایۃ، انشاء ـــ زندہ ہونا اور پیدا ہونا۔ [8]

تفسیر تدبر قرآن میں لفظ "نشاۃ ثانیہ" کی تشریح اس طرح سے ہے:

"ہمارے نزدیک 'ناشئۃ' انشاء سے ہے، جس کے معانی اُٹھنے کے ہیں۔ یہ 'عافیہ' اور 'عافہ' کے وزن پر مصدر یا حاصل مصدر ہے"۔ [9]

---

[8] المنجد، عربی، اردو لغت، مرتبہ، لوئیس (لاہور: معروف مکتبہ قدوسیہ، ۲۰۰۲)، ۸۹۱

[9] اصلاحی، امین احسن، تدبیر قرآن، (لاہور: فاران فائونڈیشن، ۱۹۹۹ء)، ۲۵۔

علامہ اقبال نشاۃ ثانیہ کے علم بردار تھے انھوں نے اپنے خطے میں "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" میں نشاۃ ثانیہ کے لیے "Reconstruction" کا لفظ استعمال کیا ہے، جسے سید نذیر نیازی نے بھی "نشاۃ ثانیہ" کے طور پر ترجمہ کیا ہے:

"If the renaissance of Islam is a fact, and I believe it is a fact, we too one day, like the Turks, will have to re-evaluate our intellectual inheritance."

"اگر اسلام کی نشاۃ ثانیہ ایک حقیقت ہے، اور میرے نزدیک یہ قطعی طور پر حقیقت ہے، تو ہمیں بھی ایک دن ترکوں کی طرح اپنے فکری ورثے کا از سرِ نو جائزہ لینا ہو گا"۔ [10]

پندرہویں صدی کے وسط تک یورپ جہالت اور پسماندگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ 1450ء سے 1600ء تک کے دور کو یورپ میں "تہذیب اور انسانیت کی دوبارہ پیدائش (Rebirth) " کہا جاتا ہے۔ یہ تحریک اٹلی سے شروع ہو کر شمالی یورپ تک پھیلی، اور ابتدائی دور کو "اطالوی رینیسانس" کہا جاتا ہے۔ اس عہد میں فنون، سائنس اور ادب میں غیر معمولی ترقی ہوئی:

آرٹ: فنکاروں نے فطری انداز کو دوبارہ زندہ کیا، منظر کشی میں سائنسی اصولوں کے مطابق فاصلے اور تناسب کو شامل کیا۔

اہم فنکار: مائیکل اینجلو (Michelangelo) اور لیونارڈو ڈاونچی (Leonardo da Vinci)۔

سائنس: گلیلیو (Galileo) نے سائنسی فکر کو نئی جہت دی۔

ادب: شیکسپیئر (Shakespeare) نے انسانی جذبات اور معاشرتی مسائل کو عالمی سطح پر پیش کیا۔

چھاپہ خانہ کی ایجاد نے علم کی اشاعت کو آسان بنایا، جس کے نتیجے میں علمی ذخائر عام ہوئے اور اصلاحی تحریکوں کو فروغ ملا۔

---

[10] محمد اقبال، تشکیل جدید الهیات اسلامی، مترجم سید نذیر نیازی، (لاہور: بزم اقبال، ۱۹۸۶ء)، ۱۰: ۲۳۶

یورپ میں پھیلاؤ اور اثرات:

نشاۃ ثانیہ کی تحریک کا آغاز اٹلی سے ہوا اور سترھویں صدی تک یہ پورے یورپ میں پھیل گئی۔ اس کے اثرات ادب، فلسفہ، آرٹ، موسیقی، سیاست، سائنس اور مذہب سمیت ہر شعبے میں محسوس کیے گئے۔ اس دور میں چھاپہ خانہ ایجاد ہوا جس نے علم کی اشاعت کو آسان بنایا۔ کتابوں کی فراہمی نے علمی ذخائر کو عام کیا اور اسی وجہ سے **مارٹن لوتھر** کی اصلاحی تحریک کو بھی تیزی سے فروغ ملا۔

مذاہب اور ہیومنزم:

اگرچہ مغربی فکر کے زیرِ اثر ہیومنزم ایک منظم فلسفۂ حیات کے طور پر سامنے آیا، لیکن انسان دوستی اور انسانی فلاح کے تصورات تقریباً تمام مذاہب میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں، خواہ وہ الہامی ہوں یا غیر الہامی۔

بدھ مت: اس مذہب کی بنیاد ہی انسان سے محبت اور انسان دوستی پر ہے۔ مہاتما بدھ نے اپنی شاہانہ زندگی ترک کر کے انسانوں کے دکھوں کا حل تلاش کیا۔ ان کی تعلیمات اس بات پر زور دیتی ہیں کہ ہر فرد کو اتنی ہی اہمیت دی جائے جتنی اپنی ذات کو دی جاتی ہے۔

یہودیت: موسوی احکامِ عشرہ میں والدین کی عزت، قتل کی حرمت، چوری، جھوٹی گواہی اور حرص و طمع سے اجتناب جیسے اصول شامل ہیں، جو انسانی معاشرت کو اخلاقی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

عیسائیت: حضرت مسیح کی تعلیمات انسانیت، محبت اور ایثار پر مبنی ہیں۔ وہ دشمنوں کے لیے دعا کرنے اور ستانے والوں سے محبت کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ صدقہ وخیرات اور دولت کو انسانیت کی خدمت میں خرچ کرنے پر زور دیتے ہیں۔

اسلام: اسلام بنیادی طور پر دینِ انسانیت ہے۔ قرآن میں انسان کو زمین پر "خلیفۃ اللہ" قرار دیا گیا ہے۔ اسلامی تعلیمات چاہے عقائد، عبادات، معاملات یا معاشرتی و معاشی اصول ہوں، ان کا مقصد انسانیت کی فلاح، عدل و انصاف اور انسانی شرف و عظمت کا قیام ہے۔

نشاۃ ثانیہ کی ابتداء اور اطالوی ہیومنزم:

اطالوی ہیومنزم دراصل قدیم ادبی و ثقافتی ورثے اور اخلاقی فلسفے کی بحالی کا ایک منظم پروگرام تھا۔ اس کے اہم مراکز فلورنس، روم، وینس اور جینوا تھے۔ پندرھویں صدی کے آخر تک یہ تحریک اٹلی میں خاصی مقبول ہو گئی اور اعلیٰ طبقے کے لوگ اس سے متاثر ہوئے۔ ابتدائی ہیومنسٹ قدیم مسودات کو محفوظ کرنے اور دوبارہ زندہ کرنے میں سرگرم تھے۔ اس تحریک کے نمایاں شخصیات میں **پیٹرارک (Petrarch)** اور **سالوتاتی (Salutati)** شامل ہیں۔ چرچ کے کئی اعلیٰ حکام، وکلا اور سکالرز بھی اس تحریک کے حامی تھے، حتیٰ کہ سولہویں صدی کے آغاز میں بعض پوپ بھی ہیومنزم کے سرپرست بن گئے۔

نشاۃ ثانیہ اور عیسائیت:

ہیومنزم کی تحریک کو چرچ کے کئی بڑے رہنماؤں اور پوپ حضرات نے بھی فروغ دیا، جن میں **پائیس دوم**، **سیکسٹس چہارم اور لیو دہم** قابلِ ذکر ہیں۔ اٹلی سے شروع ہونے والی یہ تحریک جلد ہی فرانس، جرمنی اور انگلینڈ تک پھیل گئی اور وہاں کی مذہبی اصلاحی تحریکوں کے ساتھ جڑ گئی۔ سولہویں صدی کے آغاز میں جرمن راہب **مارٹن لوتھر** نے کیتھولک چرچ کے طریقہ کار پر تنقید کرتے ہوئے اصلاحی تحریک شروع کی، جسے بعد میں "پروٹسٹنٹ اصلاح کلیسا" کہا گیا۔ لوتھر نے عقائد اور مذہبی رسومات میں تبدیلی کی بنیاد رکھی۔ اس کے مطابق:

"چرچ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ انسان کی بخشش کرے۔ خدا اور انسان کے درمیان کسی واسطے کی ضرورت نہیں۔ راہبانہ زندگی کو لازمی قرار دینا درست نہیں۔ بائبل کی بعض کتابوں کو جعلی قرار دیا گیا"۔ [11]

یوں پروٹسٹنٹ تحریک نے عیسائیت میں ایک نئے فکری اور عملی رجحان کو جنم دیا، جس نے یورپ کی مذہبی اور سماجی تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

نشاۃ ثانیہ اور عقلیت پسندی:

نشاۃ ثانیہ کے دور میں عقلیت پسندوں کی قدیم تحریروں نے اہلِ علم پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس دور کے مفکرین نے اپنے ذہن کو ماورائے فطرت تصورات کے بوجھ سے آزاد محسوس کیا اور انسان کو اس کی تمام تر

[11] Luther, M. Ninety-Five Theses. Wittenberg. (Oxford: Blackwell, 1517).

صلاحیتوں، ذہانت، خدشات اور امکانات کے ساتھ فکر کا مرکز بنایا۔ یوں انسانی عقل اور تجربے کو کائنات کی تفہیم کا بنیادی ذریعہ سمجھا جانے لگا۔ اس تحریک میں مختلف عقلی فلسفے پروان چڑھے اور انہی کے زیرِ اثر "ہیومنزم" کا فلسفہ بھی مضبوط ہوا۔ ہیومنزم نے انسان کو مرکزیت دی اور دیگر عقلی نظریات سے متاثر ہو کر اپنی بنیادیں مزید مستحکم کیں۔ مفکر برک (Burke) رینیسانس نے ہیومنزم کی خصوصیات یوں بیان کی ہیں:

"رینیسانس ہیومنزم محض ایک فلسفہ نہیں بلکہ سیکھنے کا ایک طریقہ تھا۔ اس کے ذریعے قرونِ وسطیٰ کے جامد تعلیمی طریقوں کے برعکس اصل قدیم متون کا مطالعہ کیا گیا اور دلائل و شواہد کی بنیاد پر استدلال کیا گیا۔ ہیومنزم کی تعلیم 'Studia Humanitatis' کے پروگرام پر مبنی تھی، جس میں شاعری، گرامر، تاریخ اور اخلاقی فلسفہ شامل تھے"۔[12]

ہیومنزم کے معاشرتی اثرات:

پندرہویں صدی کے وسط تک یورپ مذہبی جمود اور پسماندگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ پاپائیت نے مذہب کو اپنی اجارہ داری میں لے کر معاشرے کو گھٹن میں مبتلا کر دیا تھا۔ لیکن اصلاحِ مذہب اور احیائے علوم کی تحریکوں نے یورپ میں فکری انقلاب برپا کیا۔ مذہبی جکڑ بندیوں میں قید ذہن آزادی کی طرف مائل ہوئے۔ یورپی اقوام علمی و فکری ترقی کے ذریعے دنیا کی متمدن قوتوں سے آگے نکل گئیں۔ بقراط، سقراط، افلاطون اور ارسطو سے لے کر پندرھویں صدی تک کے علمی ذخائر دوبارہ یورپ میں کھلنے لگے۔ اگلی ڈیڑھ صدی میں یورپ کی فکری اور تہذیبی کایا پلٹ گئی۔ یہی تحریک "نشاۃ ثانیہ" کہلائی، جو ایک ثقافتی اور علمی بیداری تھی اور جس نے یورپ کے علمی افق پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

نشاۃ ثانیہ کے دور میں ایک طرف اہلِ علم یورپی عوام کو جدید علوم سے روشناس کر رہے تھے اور دوسری طرف چھاپہ خانے کی ایجاد نے علم و فنون کو دور دور تک پہنچا دیا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ پاپائیت کا اقتدار کمزور ہونا شروع ہوا۔ سب سے پہلے انگلستان کے بادشاہ **ہنری ہشتم** نے 1529ء میں پوپ کی اطاعت سے انکار کیا، جس کے

[12] Dewey, J. A Humanist Manifesto. The New Humanist. American Humanist Association, 1933.

بعد دیگر ممالک نے بھی پوپ کے روحانی اقتدار سے علیحدگی اختیار کر لی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کو یورپ کی تاریخ میں "اصلاحِ مذہب اور احیائے علوم (Reformation and Renaissance) " کہا جاتا ہے۔

ہیومنزم کے مذہب پر اثرات:

ہیومنزم کے فلسفے نے اسلام اور عیسائیت کے بنیادی عقائد پر سوالات اٹھائے۔ اس فکر کے زیرِ اثر وجودِ باری تعالیٰ، انبیاء اور آخرت جیسے تصورات کو نظر انداز کیا گیا یا انکار کر دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں انسان کو اپنی عقل اور تجربے کا مرکز بنایا گیا، لیکن خدا اور وحی کی رہنمائی سے دوری نے اخلاقی اور روحانی خلا پیدا کیا۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق دنیا میں فساد اور مشکلات انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہے:

"ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ"[13]

"یعنی خشکی اور تری میں فساد انسانوں کے اعمال کی وجہ سے ظاہر ہوا۔"

اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا گیا:

وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ[14]

"یعنی جو مصیبت تمہیں پہنچتی ہے وہ تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے، اور اللہ بہت سے گناہوں سے درگزر فرماتا ہے۔"

یہ آیات واضح کرتی ہیں کہ بعض مشکلات انسان کے اعمال کی سزا ہیں، جبکہ بعض آزمائشیں اللہ کی طرف رجوع اور بندگی کی یاددہانی کے لیے آتی ہیں۔

ہیومنزم اور جدید معاشرہ:

چونکہ ہیومنزم دین سے دوری کا نام ہے، اس لیے اس فکر کے حامل معاشروں میں سکونِ قلب اور روحانی اطمینان ناپید ہے۔ اگرچہ مادی آسائشیں فراوانی سے موجود ہیں، لیکن حقیقی سکون اور قلبی راحت نہیں ملتی۔ مذہب انسان کو برائی سے اس احساس کے ذریعے روکتا ہے کہ اسے خدا کے سامنے جواب دینا ہے، جبکہ ہیومنزم میں یہ تصور

---

[13] الروم:۴۱

[14] الشوریٰ:۳۰

سرے سے موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ فلسفہ خدا بیزاری اور اخلاقی زوال کا باعث بنتا ہے۔ مختار فاروقی مغربی فکر پر تنقید کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"مغرب کے بے خدا علم اور خدا بیزاری کے فلسفے نے اپنی پوری قوت سے ہیومنزم کے حامیوں کو اخلاقی تباہی سے دوچار کر دیا ہے۔ اس فلسفے کا اصل چہرہ سامنے لانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے تاکہ اس کی تباہ کاریوں سے بچا جا سکے۔ یہی عصرِ حاضر کی اہم ضرورت ہے"۔[15]

تحقیقی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مغرب نے آئندہ نسلوں کے لیے ایک منظم فکری منصوبہ تشکیل دیا، جسے "ہیومنزم" کہا جاتا ہے۔ اس فلسفے کا مقصد مذہبی عقائد کو پسِ پشت ڈال کر عقل اور سائنس کو زندگی کا واحد معیار بنانا تھا۔ اس فکر کے مطابق:

"دنیا میں کوئی غیبی حقیقت نہیں، انسانیت کی کسوٹی صرف عقل ہے۔ وحی اور الہامی اصولوں کو زندگی کے فیصلوں میں شامل نہیں کیا جاتا۔ ماحول اور انسانی ضرورت کو ہی آئندہ کا لائحہ عمل سمجھا جاتا ہے"۔[16]

یہی فکر آگے چل کر "احیائے علوم" یا **Renaissance** کی تحریک میں ڈھل گئی، جس کی بنیاد مذہب کی عدم مداخلت پر رکھی گئی تھی۔ یورپ میں عیسائیت سے بیزاری نے اس تحریک کو غیر معمولی حمایت دی اور یہ ایک عالمگیر فلسفہ بن کر دنیا بھر میں پھیل گیا۔

نشاۃ ثانیہ اور صنعتی انقلاب:

نشاۃ ثانیہ کی تحریک نے یورپ میں مادی ترقی کے دروازے کھول دیے۔ صنعتی انقلاب کے نتیجے میں نئی ایجادات اور انسانی استعمال کی اشیاء کی فراوانی نے مغربی معاشرے میں ایک ثقافتی انقلاب برپا کیا۔ اس انقلاب نے یورپ کی پرانی اخلاقی اقدار کو کمزور کر دیا اور مادی ترقی کو زندگی کا اصل مقصد بنا دیا۔

---

[15] Farooqi, M. Maghribi Fikr aur Humanism ka Tanqeedi Jaiza. (Lahore: Islamic Research Publications, 2008).

[16] Kurtz, P. Humanist Manifesto II. Prometheus Books, 1973.

ہیومنزم اور لادینیت:

ہیومنزم کا بنیادی مقصد انسان کی عظمت کو ثابت کرنا اور انسانی عقل و شعور کو خدا اور قدرت سے بلند مقام پر فائز کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا پر مغربی فکر اور تہذیب کا غلبہ ہے، اور مغرب اپنی تہذیب کو عالمگیر بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔ اس فکر نے مذہب سے دوری کو فروغ دیا اور لادینیت کو ایک فلسفیانہ بنیاد فراہم کی۔ مغرب نے اپنی تہذیب اور فکر کو ہیومنزم اور لادینیت کے ذریعے فروغ دیا، جو بنیادی طور پر یونانی تہذیب سے متاثر تھی۔ یونانی فکر میں بت پرستی، مادیت پرستی اور عقلیت پسندی نمایاں تھیں، اور انہی عناصر نے بعد میں مغربی ہیومنزم کو تشکیل دیا۔

جیسا کہ سید محمد سلیم بیان کرتے ہیں:

"ہیومنزم دراصل مذہب بیزاری کا فلسفہ ہے۔ مغربی معاشرے میں یہی فکر معتبر سمجھی گئی اور اسی کے نتیجے میں لادینی رجحانات کو تقویت ملی۔ سائنس پر بھی مذہب سے دوری کا رنگ غالب آیا۔ مغربی فلسفیوں نے اسے "سیکولرازم" یا آزادخیالی کا نام دیا، لیکن حقیقت میں یہ آزادخیالی نہیں بلکہ مذہب دشمنی تھی"۔[17]

امریکی ریاست **میساچوسیٹس** نے 1828ء کے تعلیمی ایکٹ کے ذریعے سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم پر پابندی عائد کی۔ بعد میں دیگر مغربی ممالک نے بھی یہی اقدامات کیے اور شہریوں کو مذہب کی تعلیم سے دور رکھا۔ ہیومنزم کے حامیوں نے اس ماحول کا فائدہ اٹھا کر دنیا کو وحی، خدا اور آخرت کے تصورات سے خالی کرنے کی کوشش کی۔ تعلیمی میدان میں مذہب بیزاری کو فروغ دیا گیا۔ اخلاقی اقدار کمزور ہوئیں اور انسان حیوانیت کی طرف مائل ہوا۔ خالص سیکولر تعلیم کا آغاز ہوا، جس کا مقصد انسان کے اندر سے مذہب کی محبت کو ختم کرنا تھا۔ "ہر چیز جائز ہے" کا نظریہ رائج ہوا، جس نے اخلاقی حدود کو توڑ دیا۔ یہی تحریک مسیحی عقائد کو کمزور کرنے اور مذہبی نظریات کو ختم کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتی رہی۔ مارٹن لوتھر نے یورپ میں اصلاحِ دین کی تحریک شروع کی۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ الہامی متون کی وضاحت اور تشریح صرف کلیسا یا پاپ کی اجارہ داری نہ رہے، بلکہ ہر شخص کو حق حاصل ہو کہ وہ براہِ راست مذہبی کتب سے رہنمائی حاصل کرے۔ لوتھر کے نزدیک:

---

[17] Salim, M. Humanism aur Maghribi Fikr. (Lahore: Islamic Publications, 2005).

"دینی معاملات کا کلی اختیار پوپ کے پاس نہیں ہونا چاہیے"۔[18]

یہ فکر دراصل عقلیت پسندی اور ہیومنزم کے اثرات کا نتیجہ تھی، جس نے فرد کو مذہبی آزادی اور براہِ راست علم تک رسائی کا حق دیا۔

جدید مغربی معاشرہ میں سیکولر تعلیم:

محمد سلیم کے مطابق:

"مغرب کی تہذیب مذہب سے انکار کی بنیاد پر قائم ہوئی ہے، اسی لیے اس کے نظامِ حیات میں مذہب دشمنی رچ بس گئی ہے"۔[19]

ہیومنزم کے مسلم معاشرے پر اثرات:

مسلم معاشروں کی فکری تاریخ بنیادی طور پر توحید کے تصور پر قائم رہی ہے، جہاں انسان کی حیثیت ایک بااختیار مگر جوابدہ مخلوق کی ہے، نہ کہ مطلق خودمختار ہستی کی۔ اس کے برعکس ہیومنزم میں انسان کو اخلاق و قانون کا حتمی منبع سمجھا جاتا ہے۔ یہی نکتہ دونوں فکری نظاموں کے درمیان بنیادی کشمکش کی بنیاد بنتا ہے۔ اس کشمکش نے مسلم معاشروں میں سوالات کو جنم دیا: کیا مذہب کو نجی دائرے تک محدود کر دیا جائے؟ کیا اخلاقی اقدار کو وحی کے بجائے انسانی تجربے سے اخذ کیا جائے؟ اور کیا ترقی کا واحد راستہ مغربی انسانی فکر کی پیروی ہے؟ اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ ہیومنزم کے اثرات یکساں نہیں رہے۔ بعض حلقوں میں اس نے انسانی حقوق، تعلیم، سماجی انصاف اور سائنسی تحقیق کے فروغ میں مثبت کردار ادا کیا، جبکہ دیگر سطحوں پر اس کے نتیجے میں مذہبی اقدار کی کمزوری، روحانیت سے دوری اور فردیت (Individualism) کے غلبے جیسے مسائل سامنے آئے۔ خاص طور پر جدید تعلیمی اداروں، میڈیا، قانون سازی اور سماجی رویّوں میں ہیومنزم کی جھلک واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے، جہاں انسانی خواہش اور عقل کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

---

[18] Salim, M. Humanism aur Maghribi Fikr. (Lahore: Islamic Publications, 2005).
[19] Luther, M. Ninety-Five Theses. Wittenberg, 1517.

اس پیچیدہ تعامل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح ہیومنزم نے مسلم معاشروں میں فکری خود اعتمادی، مذہب و جدیدیت کے تعلق، اور اخلاقی بحران کے مباحث کو نئی جہت دی۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح کیا جائے گا کہ اسلامی فکر نے محض ردِ عمل کے طور پر نہیں بلکہ ایک متبادل فکری نظام کے طور پر، انسانی وقار، عقل کی قدر اور سماجی ذمہ داری کو وحی کے دائرے میں رکھتے ہوئے، ہیومنزم کے دعووں کا کس طرح جواب دیا۔

مسلمانوں میں سیکولر تعلیم کا اثر:

ہیومنزم کی تحریک نے قوم پرستی کو فروغ دیا۔ انسان کی کامل آزادی کو بنیادی اصول بنایا۔ لادینی اور سیکولر فکر کو عام کیا۔ اسی وجہ سے بیسویں صدی میں مغربی معاشروں میں آزادی، جمہوریت، مساوات اور سائنس کے تصورات عام ہوئے۔ سیکولر تعلیم کے ذریعے الحاد کو فروغ ملا اور مذہب کو زندگی کے معاملات سے الگ کر دیا گیا۔ محمد سلیم کے مطابق:

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کے مطابق:

"مغربی سیکولر تعلیم کے اثرات مسلم معاشروں میں بھی داخل ہوئے۔ امریکہ میں بعض مسلم تنظیموں کے پروگراموں میں غیر اسلامی اور غیر اخلاقی سرگرمیاں شامل ہوئیں۔ انڈونیشیا جیسے مسلم اکثریتی ملک میں اسلامی یونیورسٹیوں میں بھی مخلوط نظامِ تعلیم رائج ہے، جس پر بعض اساتذہ ناخوش ہیں لیکن بے بس ہیں۔ عرب ممالک میں برصغیر کے دینی مدارس جیسا تصور تقریباً ختم ہو چکا ہے، اور سرکاری اداروں میں دینی تعلیم کا کوئی نمایاں نظام موجود نہیں"۔ [20]

مفتی تقی عثمانی کے مطابق مسلمانوں کا ایک طبقہ سیکولر تعلیم کو زیادہ مفید سمجھتا ہے اور دینی تعلیم کو غیر ضروری قرار دیتا ہے، جس سے اسلامی معاشرت اور اقدار کو نقصان پہنچ رہا ہے۔

ہیومنزم اور لادینیت کا فروغ:

مغرب نے اپنی تہذیب اور فکر کو ہیومنزم اور لادینیت کے ذریعے پروان چڑھایا، جو یونانی فلسفے سے متاثر تھی۔ یونانی فکر میں عقلیت پسندی، مادیت اور بت پرستی کے اثرات نمایاں تھے، اور انہی عناصر نے بعد میں مغربی ہیومنزم کو تشکیل دیا۔ جیسا کہ سید محمد سلیم نے وضاحت کی ہے:

[20] Usmani, M. T. Islam aur Maghribi Tehzeeb. (Karachi: Maktaba Ma'arif-ul-Quran, 2004).

"ہیومنزم دراصل مذہب بیزاری کا فلسفہ ہے"۔[21]

مغربی معاشرے میں یہی فکر معتبر سمجھی گئی اور اسی کے نتیجے میں لادینی رجحانات کو تقویت ملی۔ سائنس پر بھی مذہب سے دوری کا رنگ غالب آیا۔ مغربی فلسفیوں نے اسے "سیکولرازم" یا آزاد خیالی کا نام دیا، لیکن حقیقت میں یہ آزاد خیالی نہیں بلکہ مذہب دشمنی تھی۔

اسی لیے اس کے نظامِ حیات میں مذہب دشمنی رچ بس گئی ہے۔ تعلیمی اداروں میں ابتدا ہی سے غیر مذہبی تصورِ حیات پڑھایا جاتا ہے۔ سرکاری اداروں میں مذہب کی تعلیم پر پابندی لگائی گئی۔ امریکی ریاست **میساچوسیٹس** نے 1828ء کے تعلیمی ایکٹ کے ذریعے سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم پر پابندی عائد کی۔ بعد میں دیگر مغربی ممالک نے بھی یہی اقدامات کیے اور شہریوں کو مذہب کی تعلیم سے دور رکھا۔

ہیومنزم اور مسلم معاشرے میں فکری چیلنج:

ہیومنزم نے مسلم معاشروں کو ایک گہرا فکری چیلنج ضرور دیا، لیکن اس کے نتیجے میں اسلامی تصورِ انسان اور تصورِ حیات کی معنویت مزید واضح ہو گئی۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ مسلم معاشرے نہ تو مغربی فکر کی غیر تنقیدی تقلید کریں اور نہ ہی جدید دنیا کے حقائق سے آنکھیں بند کریں، بلکہ وحی کی رہنمائی میں عقل، اخلاق اور سماجی ترقی کے درمیان ایک متوازن راستہ اختیار کریں۔ یہی راستہ فرد اور معاشرے دونوں کے لیے حقیقی فلاح کا ضامن ہے۔

ہیومنزم کے اثرات اور اسلامی ردِ عمل:

فکری اثرات: ہیومنزم نے انسان کو کائنات کا مرکز اور عقل کو حتمی معیار قرار دیا، جو اسلامی فکر سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اسلام میں انسان بااختیار ضرور ہے مگر وحی کے سامنے جواب دہ بھی ہے۔

سماجی اثرات: مسلم معاشروں میں تعلیم، سیاست اور قانون کے شعبوں میں نئے سوالات اٹھے۔ بعض پہلوؤں سے ہیومنزم نے انسانی حقوق، سماجی انصاف اور سائنسی تحقیق کو فروغ دیا، لیکن مجموعی طور پر اس نے مذہب کو محدود کرنے اور فردیت کو بڑھانے کے رجحانات کو تقویت دی۔

[21] Salim, M. Humanism aur Maghribi Fikr. (Lahore: Islamic Publications, 2005).

اخلاقی بحران : وحی کے بجائے انسانی خواہش اور سماجی مفاد کو معیار بنانے سے اخلاقی بحران پیدا ہوا۔ اس کے نتیجے میں اچھائی اور برائی کی تعریف بدل گئی اور روحانیت سے دوری بڑھ گئی۔

اسلامی متبادل فکر:

موجودہ دور کی بے سکونی اور اضطراب کو صرف سیاسی یا معاشی مسائل سے نہیں جوڑا جا سکتا۔ اس کی اصل جڑ اللہ اور دین سے دوری ہے۔ ہیومنزم چونکہ خدا مرکز تصورِ حیات کی نفی کرتا ہے، اس لیے اس کے زیرِ اثر معاشروں میں مادی آسائش کے باوجود قلبی سکون ناپید ہے۔ آخرت کے تصور کے بغیر انسان کو برائی سے روکنے والی اخلاقی قوت کمزور پڑ جاتی ہے، جس کے نتیجے میں اجتماعی بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ اسلامی فکر نے ہیومنزم کے مقابلے میں محض ردِ عمل اختیار نہیں کیا بلکہ ایک متوازن اور جامع متبادل پیش کیا۔ انسانی وقار کو بنیادی حیثیت دی۔ عقل کی اہمیت کو تسلیم کیا لیکن اسے وحی کے تابع رکھا۔ سماجی ذمہ داری کو فرد کی آزادی کے ساتھ مربوط کیا۔ یوں اسلام نے ایک ایسا نظامِ حیات پیش کیا جو نہ صرف دنیاوی ترقی بلکہ روحانی سکون اور اُخروی فلاح کا بھی ضامن ہے۔